Fikr-o-Nasar (Islamabad) 13:4 (1975)

کلامِ اقبالؔ میں رجائیت

—— افتخار احمد صدّیقی ——

دنیائے ادب میں ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی کہ کوئی شاعر ایک پُرآشوب دَور سے تعلق رکھتا ہو، اُس کی قوم گوناگوں خطرات و مشکلات میں گھری ہوئی ہو، وہ حالات کی سنگینی کا گہرا شعور رکھتا ہو، اس کا دل غمِ ملّت اور دردِ انسانیت سے معمور ہو، اور پھر بھی اس کا کلام، کلامِ اقبالؔ کی طرح رجائیت کا ایک سدا بہار گلشن ہو۔

قیامِ انگلستان (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) کے انقلابی دَور میں اقبالؔ نے مارچ ۱۹۰۷ء کی ایک مشہور غزل میں اپنے اس عزم کا اظہار کیا تھا:

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

اور اسی زمانے میں اپنے ایک ہمدمِ دیرینہ (شیخ عبدالقادر) کے نام یہ پیغام بھیجا تھا:

اُٹھ کر ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور سے بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں!

اس کے بعد سے زندگی کے آخری ایّام تک اقبالؔ اپنے قومی ماحول کی بے پناہ ظلمتوں اور یاس و ہراس کی تند و تیز آندھیوں میں اُمیّد کی شمعیں روشن کرتے رہے:

ہوا ہے گو تُند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

اقبالؔ کی رجائیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے تو اس کے کئی اسباب نظر آئیں گے۔ لیکن بنیادی سبب خود شاعر کی شخصیت اور اُفتادِ طبیعت میں مضمر ہے۔ شعراء فطرۃً ذکی الحس اور دروں بیں ہوتے ہیں۔ احساس کی شدت اور دروں بینی کی بدولت عموماً ان کی زندگی اور شاعری میں

یاس والم کا عنصر غالب رہتا ہے۔ شیلی کا قول تو یہ ہے کہ ہمارے شیریں ترین نغمے وہی ہیں جو انتہائی المناک خیالات کے حامل ہوتے ہیں؟ "OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE THAT TELL OF SADEST THOUGHT" ۔ لیکن دنیا کے عظیم ترین شعراء کی شخصیت میں ہمیں احساس کی شدّت اور تخیّل و تفکّر کی قوت کا متوازن امتزاج ملتا ہے۔ ایک مفکر کا قول ہے کہ زندگی اہلِ احساس کے لئے المیہ اور اہلِ فکر کے لئے طربیہ ہے:

"LIFE IS A TRAGEDY TO THOSE WHO FEEL A COMEDY TO THOSE WHO THINK"

اقبال کو مبداء فیاض سے حساس دل کے ساتھ مفکرانہ ذہن اور قلندرانہ مزاج بھی عطا ہوا تھا۔ غالب کا یہ شعر ایسے ہی قلندروں کی فطرتِ آزاد کا ترجمان ہے:

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس — برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

لیکن اقبال کو ماتم خانے کی سوگوار فضا سے یہ لمحاتی تعلق بھی گوارا نہیں اور اس کا سبب ان کا ایمانی شعور ہے۔ فرماتے ہیں:

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش — میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرّم! — کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکر خند

وہ احساسِ غم کے ساتھ تابِ غم بھی رکھتے ہیں۔ فریاد و فغاں اُن کی شانِ درویشی کے خلاف ہے:

نہیں ہے زخم کھا کر آہ کرنا شانِ درویشی
کہ ہے ضبطِ فغاں شیری، فغاں روباہی و میشی

اور پھر اقبال کا غم نہ تو وہ "غمِ زندگی" (خوفِ جاں) ہے جو "سمِ زندگی" بن جاتا ہے، نہ وہ غمِ روزگار (ذاتی آلام و افکار) جو انسان کے لئے سوہانِ روح ثابت ہوتا ہے بلکہ یہ وہ "غمِ دیگر" (دردِ انسانیت) ہے جو زندگی کے سارے غموں کا مداوا ہے:

یک غم است آں غم کہ آدم را خورد — آں غمِ دیگر کہ ہر غم را خورد

سب سے بڑھ کر یہ کہ اقبال وہ بندۂ مومن ہیں جو خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتا:

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے — اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

اقبالؔ کی رجائیت کا دوسرا سبب اُن کا نفسیاتی شعور ہے۔ فطرتِ انسانی کے نبّاض کی حیثیت سے وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ عزم و یقین کی نفسیاتی قوت ہی زندگی میں سب سے زیادہ فعّال و مُوثر قوت ہے۔ مایوسی اور مردہ دلی افراد و اقوام کے لئے نہایت مہلک ثابت ہوتی ہے:

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ ۔۔۔ کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

یاسیّت اور قنوطیت کے ہاتھوں انسان یقین کی اس عظیم قوت سے محروم ہو جاتا ہے جو فرد اور قوم کی تقدیریں بناتی ہے:

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے ۔۔۔ یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملّت ہے

اسی لئے اقبال ادب و فن میں قنوطیت کے سخت مخالف ہیں:

شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو ۔۔۔ جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

وہ نغمہ سردیٔ خونِ غزل سرا کی دلیل ۔۔۔ کہ جس کو سُن کے ترا چہرہ تابناک نہیں

اقبالؔ کے نزدیک شاعر اور فن کار کا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے کمالِ فن سے دلوں میں آرزوئیں اور ولولے بیدار کرے کہ آرزوؤں کی مسلسل تخلیق ہی زندگی کے استحکام و دوام کی ضامن ہے:

آرزو را در دلِ خود زندہ دار ۔۔۔ تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم ۔۔۔ از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

چنانچہ اقبالؔ کے سازِ سخن میں نوائے یاس کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ ہمیشہ رجائیت سے بھرپور نغمے سناتے رہے تاکہ اُن کی مایوس و مضمحل قوم کے دل میں زندگی کی حرارت اور ایمان کی قوت پیدا ہو:

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے ۔۔۔ کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

اقبالؔ کی رجائیت کے نفسیاتی پہلو سے اس کے فلسفیانہ پہلو کا بڑا قریبی تعلق ہے۔ اقبال حکیمِ حیات ہیں اور زندگی کی تکمیل کے لئے غم و آلام کو ناگزیر سمجھتے ہیں:

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں ۔۔۔ جو خزاں نادیدہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں

غم اُن کے نزدیک ایک تعمیری و تخلیقی قوت ہے جس سے انسانی فطرت کے جوہر منکشف ہوتے اور جلا پاتے ہیں:

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال ۔۔۔ غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گردِ ملال

غمِ جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے — ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی آواز سے

یہی وجہ ہے کہ وہ غم کو ایک عطیۂ خداوندی سمجھتے ہیں ؛

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز — خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد!

خودی اور زندگی کے ارتقاء کے لئے اقبالؔ نے نطشے کی طرح تصادم و پیکار، مہم جوئی اور خطر پسندی پر بہت زور دیا ہے۔ ہمارے سکوں پرست مشرقی شعراء انقلابِ روزگار اور حوادثِ زمانہ کے ماتم گسار رہے ہیں۔ لیکن اقبالؔ، حوادث و انقلابات کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ ان ہی سے کردار میں پختگی اور خودی میں بلندی پیدا ہوتی ہے :

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی — ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

ممکنات قوتِ مردانِ کار — گرددازمشکل پسندی آشکار

افراد کی طرح اقوام کی بقا کا انحصار بھی مسلسل کش مکش، پیہم جہاد و پیکار پر ہے۔ جب کوئی قوم کسی چیلنج سے دوچار ہوتی ہے تو اس کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں اس پر غلبہ پانے کے لئے ابھر آتی ہیں اور اس آزمائش سے گزرنے کے بعد قوم کو نئی توانائی اور نئی زندگی حاصل ہوتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں ان ہی قوموں کو سربلندی نصیب ہوئی جو مشکلات و مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرتی رہی ہیں۔ اقبالؔ نے اپنی ایک مختصر نظم میں ارتقاء کے اسی اصول کو بیان کیا ہے۔ نظم کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؛

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام — یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۴ء تک کا زمانہ ملتِ اسلامیہ کی تاریخ کا شدید بحرانی دور تھا۔ مسلمانانِ ہند، جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان میں اپنے بھائیوں کی خون ریزی اور اقوامِ مغرب کی فتنہ انگیزی سے بے حد مضطرب تھے۔ شاعرِ ملت نے بھی اس کربِ اضطراب کو شدت سے محسوس کیا لیکن ان کی عارفانہ نگاہ سے یہ نکتہ اوجھل نہ ہو سکا ؛

ہے جو ہنگامہ بپا حملۂ بلغاری کا — غافلوں کے لئے پیغام ہے بیداری کا

تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دل آزاری کا — امتحاں ہے ترے ایثار کا خود داری کا

کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے — نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

جنگِ عظیم اوّل (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے بعد جب مسلمانوں کی مرکزی قوت کا شیرازہ منتشر ہو گیا تھا اور خاک و خون میں ڈوبی ہوئی بہادر ترک قوم، حیات و موت کی کش مکش میں مبتلا تھی، اس وقت اقبال کی حکیمانہ بصیرت "خضرِ راہ" بن کر یہ پیغام دیتی ہے کہ تخریب کے یہ ہنگامے تعمیرِ نو کا پیش خیمہ ہیں:

ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو　　　مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

گفت رومیؔ ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند　　　می ندانی "اوّل آں بنیاد را ویراں کنند"

"طلوعِ اسلام" میں جا بجا اسی حقیقت کا اظہار ہوا ہے:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے　　　تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے　　　کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

اقبال کی رجائیت کی مذہبی بنیاد، دیگر اسباب و عوامل سے زیادہ اہم و استوار ہے۔ ایک زمانہ تھا جب عجمی تصوف کے رہبانی اور قنوطی نظریات، اقبال کے ذہنی انتشار و اضطراب کا باعث تھے۔ لیکن قرآن مجید کے گہرے مطالعے کے بعد جب وہ انسانی شرف و عظمت اور استخلافِ آدم کے انقلابی تصور سے پوری طرح آشنا ہوئے تو اس نتیجے پر پہنچے کہ انسان کا نصب العین فنائے ذات یا تقدیر پرستی نہیں بلکہ "تخلقوا باخلاق اللہ" کے ارشادِ نبوی کے مطابق خدا کی صفات کو اپنے اندر جذب کر کے نیابتِ الٰہی کا منصب حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ ارتقائے حیات اور انسانی خودی کے لامحدود امکانات پر ان کا ایمان راسخ ہو گیا:

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود　　　ایں مئے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا　　　حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفٰے سے مجھے　　　کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام　　　یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک

اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی اُن پر منکشف ہوئی کہ عالمِ انسانیت کا مستقبل نظامِ عدل کے قیام اور اس ابدی پیغام سے وابستہ ہے جو قرآن کی صورت میں موجود ہے۔ چونکہ ملّتِ اسلامیہ اس نظام اور اس پیغام کی حامل ہے لہٰذا انسانیت کی تکمیل کے لئے ملّت کی بقا بھی نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تمام عرصے میں جب ہر طرف اسلامی ممالک کی شکست و ریخت کا دردناک منظر دکھائی دے

رہا تھا، ملت کے درخشاں مستقبل پر اقبالؔ کا ایمان غیر متزلزل رہا:

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

یہ اس نظم "مسلم" (۱۹۱۲ء) کا شعر ہے جو عین اس وقت کہی گئی جب جنگِ طرابلس اور جنگِ بلقان کی تباہ کاریوں اور خوں ریزیوں سے عالمِ اسلام میں کہرام مچا ہوا تھا۔ اس نظم کے چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں:

ہم نشیں مسلم ہوں میں توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل ہوں میں

حق نے عالم اس صداقت کے لئے پیدا کیا
اور مجھے اس کی حفاظت کے لئے پیدا کیا

قسمتِ عالم کا مسلم کوکبِ تابندہ ہے
جس کی تابانی سے افسونِ سحر شرمندہ ہے

"شمع و شاعر" (۱۹۱۲ء) اسی دور کی دوسری نظم ہے جس میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے اسی ایمان افروز حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے:

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اور بالآخر ۱۹۲۲ء میں اقبالؔ کی رجائیت کے شاہکار یعنی "طلوعِ اسلام" کے ولولہ انگیز اشعار میں ایمان و یقین کا یہ پیغام یوں ادا ہوا ہے:

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

مکاں فانی مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا